IQBAL REVIEW (67: 2)
(April– June 2026)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

خودی کی تفہیم کے لیے زندہ رُود کا استعارہ

Zinda Rud as a Metaphor for Understanding Khudi

غلام مرتضیٰ انجم

Abstract

This article examines Allama Muhammad Iqbal's philosophy of *khudi* through the symbolic framework of *Zinda Rud*, a metaphor used in *Javid Nama* to represent dynamic selfhood, creative movement, self-reliance, and service to humanity. The study argues that Iqbal's concept of *khudi* is not merely an abstract philosophical idea but the central organizing principle of his entire intellectual system. It integrates spiritual awareness, moral discipline, action, love, and individuality into a comprehensive vision of human perfection. The article explores the four major qualities of *Zinda Rud*: continuous flow, self-sufficiency, usefulness for others, and preservation of its independent identity. These qualities are interpreted as symbolic expressions of Iqbal's ideal human being, the *mard-i-momin*, who remains active, self-reliant, creative, and socially beneficial without losing his individuality. The discussion further highlights Iqbal's critique of passivity, imitation, dependency, colonial exploitation, and forms of mysticism that dissolve personal identity. In this perspective, *khudi* becomes a means of personal awakening, collective

reconstruction, ethical responsibility, and spiritual elevation. The article concludes that *Zinda Rud* is one of the most meaningful metaphors for understanding Iqbal's intellectual personality and his philosophy of life, action, freedom, and creative selfhood.

Keywords

Iqbal, Khudi, Zinda Rud, Javid Nama, Selfhood, Mard-i-Momin, Self-Reliance, Creative Action, Spiritual Individuality, Philosophy of Life

اقبال فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی؛ اس لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ انہیں شاعرِ فلسفی کہا جائے یا فلسفی شاعر۔ ان کے مجموعۂ کلام کی وسعت بھی غیر معمولی ہے اور اس میں فلسفیانہ افکار کا سرمایہ بھی نہایت وقیع ہے۔ جہاں ان کا شاعرانہ کمال اپنی بلندیوں کو چھوتا ہے، وہاں ان کے افکار کی گہرائی بھی پوری قوت سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اقبال کے فلسفے میں تصورِ خودی کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے تمام افکار اسی مرکز کے گرد گردش کرتے ہیں اور بالآخر اسی تصور کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے حکیمانہ افکار کا سرچشمہ خودی ہے۔ جب تک اس مرکزی تصور کو سمجھا نہ جائے، افکارِ اقبال کے کسی بھی پہلو پر کامل دسترس حاصل نہیں ہو سکتی۔ خودی دراصل فکرِ اقبال کی روح اور اس کے فکری نظام کی وحدت ہے۔ اگر اس نظامِ حکمت کے کسی جزو کو تصورِ خودی سے الگ کر دیا جائے تو وہ اسی طرح بے معنی اور بے جان ہو جاتا ہے، جس طرح جسمِ حیوانی سے جدا کیا ہوا عضو زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ پس اقبال کے فکری وجود کو مربوط اور زندہ رکھنے والی اصل قوت تصورِ خودی ہی ہے۔

عصرِ حاضر میں اگر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کا ایسا علمی اور معقول جواب مطلوب ہو جسے جدید انسان بھی سمجھ سکے، تو اس کے لیے اقبال کا نظامِ حکمت نہایت اہم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اقبال کا تصورِ خودی اجتہادی فکر کی ایک بلند ترین مثال ہے، جس میں انسانی شخصیت، عمل، ارادہ اور روحانی ارتقا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے حقیقی عرفان کا بنیادی سرچشمہ قرآنِ مجید ہے۔ اگرچہ حکماء اور صوفیا کے ہاں اس تصور کی جھلکیاں ملتی ہیں، تاہم اقبال نے اسے ایک مربوط فلسفیانہ نظام کی صورت دی۔ ان کے ہاں مشرق و مغرب، قدیم و جدید اور تہذیب و ثقافت کے متنوع عناصر ایک تخلیقی امتزاج میں ڈھل جاتے ہیں۔ اقبال نے کہا:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری، جدید و قدیم[1]

خودی کے فروغ میں ایک ارتقائی عمل کارفرما ہے۔ یہ مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتی ہے اور اپنی تکمیل کی طرف سفر کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ میں:

> خودی کی منتہا منزل کبریا ہے، اس منزل تک پہنچنے میں بے شمار پیچ و خم یا پُرخطر راستوں سے گزرنا پڑتا ہے، عشق رہنمائی کرتا ہے۔ اِس کے سوز و ساز، درد و داغ سے خودی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔[2]

خودی کی منتہا منزل کبریا ہے، اس منزل تک پہنچنے میں بے شمار پیچ و خم یا پُرخطر راستوں سے گزرنا پڑتا ہے، عشق رہنمائی کرتا ہے۔ اِس کے سوز و ساز، درد و داغ سے خودی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خودی محض کوئی تجریدی تصور نہیں بلکہ پوری انسانی شخصیت کا نام ہے؛ ایسی شخصیت جو بیداری، جدوجہد اور مسلسل تخلیقی عمل کی حالت میں ہو۔ یہ خودی ماضی کے تجربات، موروثی اثرات اور حال کے محرکات کو جذب کرکے اپنے لیے نیا راستہ بناتی ہے۔ اسی بناپر اقبال کہتے ہیں:

اقبال کہتے ہیں :

تجربے کا مرکز یادماغ یاخودی ہی اس دُنیا میں تنہا ایک حقیقت ہے۔[۳]

اقبال مزید فرماتے ہیں :

ہم جسے خودی کہتے ہیں وہ ایک گزرتے ہوئے ارتعاش کا اُبھرتے ہوئے ارتعاش اور اِس اُبھرتے ہوئے ارتعاش کا بعد میں اُبھرنے والے ارتعاش سے کام لینے کا عمل ہے۔[۴]

مذہبی اصطلاح میں اسے فیضانِ الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہی خودی انسان کو شخصیت کی تکمیل، جوشِ عمل، فقر، صدق، خوفِ خدا، بلند پروازی، فولادی عزم، قہاری و غفاری، قدوسی و جبروت، پختہ ایمان، حیا، پاکیزہ خیالات، نرم گفتاری، گرم جستجو اور عدل جیسی صفات سے آراستہ کرتی ہے۔ یوں اقبال کے ہاں خودی انسان کی روحانی، اخلاقی اور عملی قوتوں کا مرکز بن جاتی ہے۔

اقبال کے فلسفۂ خودی کا نقطۂ عروج افراد کے کردار کی تعمیر ہے۔ ان کے نزدیک خودی انسان کی حقیقت، اس کی دریافت اور اس کی تکمیل کا نام ہے۔ یہ محض بدن یا روح کا مسئلہ نہیں بلکہ انسان کے باطن میں پوشیدہ ایک راز ہے۔ اقبال کا پیغام یہی ہے کہ انسان اپنے اندر اتر کر زندگی کا سراغ پائے۔ یہ سفر رسالتِ محمدی ﷺ کی رہنمائی میں طے ہوتا ہے، مگر خودی عقل کے پیچیدہ استدلال سے نہیں، عشق کے انہماک اور عرفانِ ذات سے دریافت ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اقبال یوں اشارہ کرتے ہیں:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل[۵]

خودی دراصل انکشافِ ذات ہے؛ یعنی انسان کا خود کو پہچاننا اور اپنے باطن میں اترنا۔ یہ باہر کا نہیں، سراسر اندر کا سفر ہے۔ اس سفر میں انسان کو اپنی ذات کی محدودیت سے گزر کر محبوبِ حقیقی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کو خواجہ میر دردؔ نے یوں بیان کیا ہے:

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا[6]

خواجہ غلام فریدؒ بھی اسی باطنی مشاہدے کو اپنے مخصوص صوفیانہ رنگ میں یوں بیان کرتے ہیں:

سبھ صورت وچ وسدا سوہنا ڈھولا ماہی
دل اساڈی کھسدا سوہنا ڈھولا ماہی[7]

اقبال نے "جاوید نامہ" میں اپنے لیے "زندہ رُود" کا نام اختیار کیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال نے اپنے عام کلام میں عموماً "اقبال" ہی کو بطور نام یا تخلص استعمال کیا، مگر "جاوید نامہ" میں وہ "زندہ رُود" کے نام سے سامنے آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقبال اس نام میں اپنی متحرک، تخلیقی اور زندگی بخش خودی کا استعارہ دیکھتے تھے۔

زندہ رُود "اصفہان (ایران) کے ایک مشہور دریا کا نام ہے اس کا اصل نام "زایندہ رُود" ہے۔ زایندہ کا مطلب خود پیدا کرنے والا بمعنی ماں کے ہیں۔[8] معلوم ہوتا ہے کہ لفظ زایندہ رُودِ کثرت استعمال سے مخفف ہو کر "زندہ رُود" رہ گیا۔ جو مختصر بھی ہے اور پرُ معنی بھی۔ "زندہ رُود" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا پانی ضائع نہیں ہوتا اور سب کا سب زراعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔" اور یہ کہ :

زندہ رُود کسی دریا یا سمندر میں نہیں گرِتا۔ یہ ایران کا سب سے بڑا دریا ہے جس کی لمبائی چار سو کلو میٹر ہے۔[9]

علامہ محمد اقبال کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال کی تصنیف بھی "زندہ رُود" ہے جو اقبال کے احوال و آثار پر مبنی ایک جامع دستاویز ہے جب کہ اس سے قبل "زندہ رُود" نام کی پہلی کتاب خسرو پرویز کے دورِ سلطنت (۶۲۸ء۔۔۔۵۹۰ء) میں ارزم نامی ایک زرتشتی دانشور نے تصنیف کی۔ یہ شخص اصفہان کا رہائشی تھا۔[10]

اقبال کے کلام میں کئی دریاؤں کے نام بطور استعارہ آتے ہیں، مثلاً دریائے راوی، نیل، دجلہ، فرات، گنگا، کاویری اور وادالکبیر۔ دریائے کاویری سے اقبال کو خاص نسبت ہے، چنانچہ وہ ٹیپو سلطان کی زبان میں اسے بھی "زندہ رُود" کے مفہوم میں یاد کرتے ہیں:

باہماں سوزے کہ در سازو بجاں
یک دو حرف از ما بہ کاویری رساں!
در جہاں تو زندہ رُود اور زندہ رُود
خوشترک آید سرود اندر سرود[11]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے لیے ''زندہ رُود'' ہی کا استعارہ کیوں منتخب کیا؟ ڈاکٹر سید محمد اکرام شاہ کے مطابق زندہ رُود اپنی چند بنیادی صفات کی بنا پر دوسرے دریاؤں سے ممتاز ہے:

زندہ رُود دُنیا کے دیگر تمام دریاؤں کی نسبت درج ذیل چار خوبیوں کی بنا پر انفرادیت کا حامل ہے۔ ا۔ دریائے رواں ہے، ۲۔ اپنے چشموں کے پانی سے ہی بنتا ہے کسی کا محتاج نہیں، ۳۔ تمام پانی انسانی حیات کے کام آتا ہے، کسی سمندر میں نہیں گرتا بلکہ صحراؤں کو سرسبز کرتا زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔[۱۲]

یہ خصوصیات اقبال کی فکری شخصیت اور فلسفۂ خودی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ خودی بھی ایک رواں، خود آگاہ، خود کار اور زندگی بخش قوت ہے۔ وہ دوسروں کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ اپنے باطن سے قوت حاصل کرتی ہے اور انسانی زندگی کو حرکت، تازگی اور معنویت عطا کرتی ہے۔

زندہ رُود کی پہلی صفت اس کا رواں ہونا ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی جمود کا نہیں، حرکت کا نام ہے۔ وہ انسان کو مسلسل پیش رفت، جدوجہد اور وسعت کی دعوت دیتے ہیں:

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول[۱۳]

اقبال جوش، حرکت اور عمل کے شاعر ہیں۔ پانی کی نمایاں خصوصیت بھی یہی حرکت اور زندگی بخشی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ۔ ترجمہ: ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔[۱۴]

اقبال نے اظہارِ خودی کے لیے پانی کی روانی، موج، دریا اور ساحل کی علامتوں کو نہایت مؤثر انداز میں استعمال کیا ہے:

کبھی دریا سے مثل موج اُبھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر![۱۵]

اقبال کے نزدیک زندگی محض سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں بلکہ اعتمادِ ذات، جذبۂ عشق، حرکت اور تخلیقی عمل کا نام ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اسی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

افضل ترین زندگی وہ ہے جو جہانِ آب و گل کے ساتھ متعلق رہ کر بھی نہ صرف غیر معمولی ہو بلکہ اس جہانِ آب و گل کو تسخیر کرنے کی قوت بھی رکھتی ہو۔[۱۶]

اس طرح "زندہ رُود" اقبال کے فلسفۂ خودی کا ایک نہایت بامعنی استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ استعارہ خودی کی روانی، خود کفالت، زندگی بخشی اور تخلیقی قوت کو ایک ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کرے، اسے عشق و عمل سے مستحکم بنائے اور زندگی کو جمود کے بجائے مسلسل حرکت، تسخیر اور تخلیق کا میدان سمجھے۔

فکرِ اقبال میں حصولِ قوت ایک بنیادی محرک ہے۔ خودی اسی جذبۂ قوت کے تحت لازمانی اور لافانی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ جب انسان میں احساسِ عمل بیدار ہوتا ہے تو خودی ایک ظاہری پیکر میں ڈھلنے لگتی ہے، اور اس پیکر کی تکمیل کے لیے جس غیر معمولی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اقبال کے نزدیک عشق ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خودی اور اس کی جملہ صفات کا کامل مظہر اقبال کی اصطلاح میں مردِ مومن ہے۔ یہی مردِ مومن انسانی تہذیب کی روح کا امین اور فلسفۂ خودی کی معراج ہے۔ اقبال اسی انسانی عظمت کو یوں بیان کرتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے[۱۷]

خودی کے عرفان میں بیرونی مزاحمتوں کا سامنا بھی ناگزیر ہے۔ انسان حرکت و جوش، جذب و عشق، عقل و ادراک اور عمل و انقلاب کے ذریعے زندگی کو مسخر کرتا ہے۔ پانی کی طرح زندگی بھی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ یہ ازل سے رواں دواں ہے اور ایک ایسی ہمہ گیر قوت ہے جس میں زمان و مکان کی گردشیں سمٹ آتی ہیں۔ جب اس قوت کو اپنے وجود، اپنی انفرادیت اور اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو یہی خودی کہلاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات کا سکون بھی دراصل حرکت ہی کا ایک پردہ ہے:

فریب نظر ہے سکون و ثباتِ
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[۱۸]

زندہ رُود کی دوسری اہم صفت یہ ہے کہ یہ اپنے چشموں کے پانی سے اپنا وجود بناتا ہے اور کسی دوسرے دریا یا ندی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی سے اقبال کا یہ درس سامنے آتا ہے کہ انسان اپنی دنیا خود پیدا

کرے، اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور فرد یا قوم کی حیثیت سے دوسروں پر انحصار نہ کرے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کوشش کا نام ہے، استحقاق کا نہیں:

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرّ آدم ہے، ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی[۱۹]

اپنی دنیا آپ پیدا کرنا دراصل خودی کی تکمیل کا نام ہے۔ جو افراد اپنی قوتِ فکر، ارادے اور عمل سے کام نہیں لیتے، وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک سوال انسان کی خودی کو کمزور کر دیتا ہے۔ جس طرح خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے، اسی طرح بے عملی، تقلید اور دوسروں پر انحصار سے ضعیف ہو جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو ذاتی کوشش کے بغیر حاصل ہو، اقبال کی نظر میں کسی نہ کسی درجے میں سوال ہی کی صورت ہے:

جس طرح خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ اسی طرح سوال کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو ذاتی کوشش کے بغیر حاصل ہو۔ تحتِ مقولۂ سوال ہے۔ ایک دولت مند آدمی کا لڑکا جو اپنے والدین کی دولت ورثہ میں حاصل کرتا ہے دراصل ایک سائل (بھکاری) ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی سائل (گدا گر) ہی ہے، جو دوسروں کے افکار و خیالات کی تقلید کرتا ہے یا ان کو اپنے افکار و خیالات بناتا ہے۔[۲۰]

اسی بنا پر وہ انسان کو اپنے باطن میں اترنے اور اپنی حقیقت دریافت کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن[۲۱]

زندہ رُود اس اعتبار سے خودی کی تکمیل کا نہایت بامعنی استعارہ ہے۔ یہ انسان کو تقلید کے بجائے اجتہاد، انحصار کے بجائے خود اعتمادی، اور جمود کے بجائے تخلیقی عمل کا درس دیتا ہے۔ مقلد ہمیشہ دوسروں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے، جب کہ حقیقی انسان اپنی سوچ کو آزاد رکھتا ہے اور نئے راستے پیدا کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مادی اور روحانی ترقی کے لیے خود کوشش کرے۔ نئی فکر، نیا شعور اور نئے خیالات ہی نئے جہاں کی تخلیق کا ذریعہ بنتے ہیں:

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا[۲۲]

یوں فلسفۂ اقبال انسان کو متحرک، خود اعتماد، مضبوط اور آزاد فکر کا حامل بناتا ہے۔ اس فلسفے کا اصل پیغام یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہچانے، اسے عشق و عمل سے مستحکم کرے اور اپنی تقدیر خود تعمیر کرے۔

زندہ رُود کی دوسری خاصیت میں خودداری اور خود انحصاری کا اصول پوشیدہ ہے، اور یہی اقبال کے تصورِ خودی کا مرکز و محور بھی ہے۔ اقبال نے فلسفۂ خودی کے ذریعے انسان کو بیداری، خود اعتمادی اور خود مختاری کا پیغام دیا۔ ان کے نزدیک خودی کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ انسان دوسروں کے سہارے پر نہ رہے، بلکہ اپنی راہ خود ہموار کرے۔ اقبال کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے [۲۳]

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس غلامی اور محتاجی خودی کو کمزور کرتی ہیں۔ اقبال غلامی کو انسان کی قوتِ عمل اور یقین کے لیے زہرِ قاتل سمجھتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں [۲۴]

اقبال کے نزدیک غلامی کی زنجیریں ذوقِ یقین، خود اعتمادی اور خودی کی بیداری ہی سے ٹوٹتی ہیں۔ جو انسان اپنی ذات پر یقین رکھتا ہے، وہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا۔ یہی اصول افراد ہی نہیں، قوموں کی زندگی میں بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ فلسفۂ خودی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے لامحدود امکانات کو دریافت کرے، کیونکہ اقبال کے نزدیک خودی وہ قطرہ ہے جس میں دریا کی وسعتیں پوشیدہ ہیں۔ حقیقی انسان آفاق میں گم ہونے والا نہیں، بلکہ آفاق کو اپنی ذات میں سمو لینے والا ہے۔

اقبال انسان کو محض جسمانی حدود کا پابند نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے وجود کو ایک ایسی باطنی کائنات قرار دیتے ہیں جس میں بے شمار امکانات اور صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ جب انسان اپنی داخلی قوتوں کو بیدار کرتا ہے تو وہ دنیاوی قید و بند سے بلند ہو کر ایک آفاقی حقیقت کی طرف سفر کرتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے عصرِ حاضر میں سب سے زیادہ خود جوئی اور خود یابی کی تعلیم دی۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی ہی اسرارِ حیات کا سب سے بڑا دریا ہے۔

زندہ رُود کی تیسری صفت یہ ہے کہ اس کا تمام پانی دوسروں کے کام آتا ہے۔ اسی طرح اقبال کے نزدیک خودی کی استقامت صرف خود اعتمادی میں نہیں، بلکہ ایثار، خدمت اور انسانیت نوازی میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا کمال یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لیے نفع بخش بنے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے[۲۵]

اقبال کے تصور میں انسان کی معراج خودی کی ترقی میں مضمر ہے، اور خودی کی یہ ترقی خدمتِ خلق کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ فرائض ادا کرے اور بنی نوع انسان کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ اقبال کے نزدیک انسانیت کی خدمت مذہبی فریضہ بھی ہے اور اخلاقی ذمہ داری بھی۔ خواجہ میر درد فرماتے ہیں:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں[۲۶]

زندہ رُود کی یہ خوبی کہ اس کا سارا پانی انسانی حیات کے کام آتا ہے، فکرِ اقبال کے تناظر میں خدمت، ایثار اور فلاحِ انسانیت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ دوسروں کی بہبود کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنا اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ فرمان ہے:

ترجمہ: نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔[۲۷]

یوں زندہ رُود کا استعارہ اقبال کے فلسفۂ خودی میں خودداری، خود انحصاری اور خدمتِ خلق کو ایک ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک کامل انسان وہ ہے جو اپنی خودی کو بیدار کرے، دوسروں کا محتاج نہ ہو، اپنی تقدیر خود تعمیر کرے اور اپنی قوتوں کو انسانیت کی فلاح کے لیے وقف کر دے۔

اقبال کے نزدیک صحت مند معاشرہ وہی ہے جس میں جذبۂ خدمت، ایثار اور باہمی تعاون زندہ ہو۔ وہ محض انفرادیت کے نہیں، اجتماعیت کے قائل ہیں۔ نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں بھی اقبال نے اجتماعی زندگی، باہمی محبت، قربانی اور خدمتِ خلق کو نہایت اہم قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہیں۔ حدیث میں ہے:

خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعَھُمْ لِلنَّاسِ○

ترجمہ: لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔[۲۸]

اقبال کے نزدیک انسانِ کامل، مردِ مومن اور کامل خودی کا حامل وہی ہے جو اپنی ذات کے خول سے نکل کر دوسروں کے لیے جیتا ہو۔ وہ عبادات کو بھی محض رسمی اعمال نہیں سمجھتے بلکہ انہیں انسان کے باطن کی تبدیلی، اخلاقی بیداری اور خدمتِ انسانیت سے وابستہ کرتے ہیں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے[۲۹]

یہاں اقبال عبادات کی روح کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم کی ترقی کا راز افراد کے باہمی تعاون، ایثار اور خدمت میں پوشیدہ ہے۔ یہی جذبہ فرد کی خودی کو بلند کرتا ہے اور معاشرے میں ہم آہنگی، امن اور ترقی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی زندگی ملتِ اسلامیہ کی اصلاح اور بیداری کے لیے وقف کر دی۔ ”اسرارِ خودی“ سے ”ارمغانِ حجاز“ تک ان کی فکر کا مرکزی مقصد ملت کی تعمیر، خودی کی بیداری اور اجتماعی حیات کی تجدید رہا۔ وہ فرماتے ہیں:

بیاتا کار ایں اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم![۳۰]

اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو فکری بیداری کا پیغام دیا اور ان قوتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کی ملی شناخت کو کمزور کرنا چاہتی تھیں۔ وہ دین و وطن کے معرکے کو معمولی سیاسی اختلاف نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ملت کی بقا کا مسئلہ قرار دیتے تھے:

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرارؓ بھی ہے[۳۱]

اسی تناظر میں انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے اس بیان سے اختلاف کیا کہ ”قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔“ مولانا مدنی کا یہ بیان ۹ جنوری ۸۳۹۱ء کو دہلی کے ”جرائد تیج“ اور ”انصاری“ میں شائع ہوا۔ چند روز کے بعد روزنامہ ”الامان“ اور ”وحدت“ میں بھی شائع ہوا۔ پھر لاہور سے ”زمیندار“ اور

روزنامہ "انقلاب" میں بھی شائع ہوا۔[۳۲] اقبال کے نزدیک ملت کی بنیاد جغرافیہ نہیں بلکہ دین، رسالتِ محمدی ﷺ اور مشترک روحانی نصب العین ہے۔ اس اختلاف کے جواب میں انہوں نے یہ اشعار کہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ
زدیو بند حسین احمد، ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است[۳۳]

اس نظم کی اشاعت پر شدید ردِ عمل سامنے آیا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

اس کی اشاعت پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔[۳۴]

لیکن اقبال نے فتاویٰ اور مخالفت کی پرواہ کیے بغیر ملتِ اسلامیہ کی بیداری کا پیغام جاری رکھا۔ زندہ رُود کی طرح انہوں نے بھی اپنی زندگی دوسروں کے لیے صرف کی۔ وہ اپنے فکر و نظر اور سعی و عمل کے نذرانے کبھی ملت کے حضور اور کبھی پوری انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔

زندہ رُود کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو کسی سمندر یا دوسرے دریا کی نذر نہیں کرتا، بلکہ خشک صحراؤں کو سیراب کرتا ہوا زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس صفت میں اقبال کے فلسفۂ حیات کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ زندگی اقبال کے نزدیک پیہم سفر، مسلسل تغیر اور دائمی حرکت کا نام ہے۔ وہ جمود کو موت اور حرکت کو زندگی قرار دیتے ہیں:

دریں چمن دلِ مرغاں زماں زماں دگر است
بشاخِ گل دگر است و بآشیاں دگر است[۳۵]

اقبال کے نزدیک یہ دنیا ابھی نقشِ ناتمام ہے۔ اسے ارتقا کی منازل سے گزرنا ہے، اور انسان اپنے عمل کے ذریعے اس ناتمام پیکر کو تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔ صاحبِ عمل انسان کا آج اس کے کل سے مختلف ہوتا ہے؛ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ زندگی کی حرارت، حرکت اور تخلیقی قوت سے محروم ہے۔ زندگی کی فطرت تخلیق، ارتقا اور پیکار ہے؛ سکون اور جمود اس کے لیے بے معنی ہیں۔

اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال ایک خط میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں:

میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گرانمایہ ہے کہ جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور واشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام واستقلال حاصل ہوتا ہے۔ چناں چہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو، مردود قرار دیا ہے۔[۳۶]

اقبال کے ہاں پیکار اور مبارزت زندگی کی لازمی شرط ہیں۔ کمزوری اور ناتوانی خواہ کتنے ہی حسین رنگ میں کیوں نہ پیش کی جائے، وہ زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ غلامی انسان کی خودی کو کمزور کرتی ہے اور اسے سخت کوشی، عمل اور استقلال سے محروم کر دیتی ہے۔ زندگی دراصل خیر و شر کی رزم گاہ ہے، اور آج کی رونق گزرے ہوئے کل کی جاں فشانیوں کا نتیجہ ہے:

زندگی پیہم مصافِ نیش و نوش
رنگ و نم امروز را از خونِ دوش[۳۷]

یوں زندہ رُود کا استعارہ اقبال کے فلسفۂ خودی میں حرکت، خود انحصاری، خدمتِ خلق اور تخلیقی پیکار کی علامت بن جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک کامل انسان وہ ہے جو اپنی خودی کو بیدار کرے، دوسروں کے لیے نفع بخش بنے، جمود سے بچے اور مسلسل عمل کے ذریعے اپنی ذات اور معاشرے دونوں کو ارتقا کی طرف لے جائے۔

زندگی اگر امید کے احساس سے سرشار ایک رواں دریا ہے، جو پہاڑوں میں راستہ بناتا، پتھروں سے ٹکراتا اور نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، تو امید سے محروم زندگی پر موت کے سائے چھا جاتے ہیں۔ ایسی زندگی میں خودی اور خود انحصاری کے روشن امکانات دھندلا جاتے ہیں، اور انسان اپنی تابناک حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔

فکرِ اقبال کا مرکزی نکتہ خودی کی حفاظت ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ چھوٹی سی ندی بھی قابلِ تحسین ہے جو اپنی ہستی کو محفوظ رکھنے کے لیے زمین میں جذب ہو جاتی ہے، مگر خود کو کسی سمندر کے حوالے نہیں کرتی۔ زندہ رُود کی بہترین تعبیر بھی یہی ہے:

اے خنک جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دل خاک فرو رخت و بہ دریا نہ سید[۳۸]

خودی کی حفاظت دراصل فرد کی شخصیت، عزتِ نفس، داخلی شعور اور اخلاقی استقلال کی حفاظت ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی میں انسان کو اپنی ذات پہچاننے، اپنی صلاحیتیں بیدار کرنے اور اعلیٰ مقاصدِ حیات کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ حفاظت صرف جسمانی وجود تک محدود نہیں، بلکہ ذہنی، روحانی اور اخلاقی سطح پر بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے ایمان، نظریات اور اصولوں پر قائم رہے اور انھیں بیرونی دباؤ یا ذاتی مفادات کی نذر نہ کرے۔

قرآنِ حکیم میں بھی نفس کی پاکیزگی اور شخصیت کی تعمیر کو کامیابی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○

ترجمہ: کامیاب وہ ہے جو اپنے نفس کو پاک کرے اور ناکام وہ ہے جو اسے آلودہ کرے۔[۳۹]

فلسفۂ اقبال کی رُو سے خودی کی تعمیر اخلاقی برتری، روحانی ارتقا اور ضبطِ نفس سے ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں نفس کے تین درجات بیان کیے گئے ہیں: نفسِ امارہ، جو برائی کی طرف مائل کرتا ہے؛ نفسِ لوامہ، جو اپنی غلطیوں پر ملامت کرتا ہے؛ اور نفسِ مطمئنہ، جو اللہ کی رضا پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ خودی کی حفاظت کا اصل تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کو نفسِ مطمئنہ کی طرف لے جائے۔

اقبال کے نزدیک خودی کو استحکام عشق سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ عشق اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہے اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے وابستگی بھی۔ اسی عشق سے انسان میں اخوت، ایثار اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ سلیمانی
اُخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی[۴۰]

معاشرتی سطح پر خودی کی حفاظت ایک باوقار، مضبوط اور منظم قوم کی تشکیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ وہ قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی تہذیب، زبان، تاریخ اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کرتی ہیں۔ اقبال نوجوانوں کو اسی اخلاقی اور تہذیبی خود آگہی کا درس دیتے ہیں:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا[۴۱]

عصرِ حاضر میں گلوبلائزیشن، مغربی ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات، سوشل میڈیا اور مادہ پرستی نے انسان کو اپنی اصل سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی حفاظت کوئی محض

فلسفیانہ تصور نہیں بلکہ عملی زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ یہ انسان کو جمود، تقلید اور بے خودی سے بچاتی ہے۔ اگر خودی اپنی انفرادیت کھو کر کسی دوسری خودی میں جذب ہو جائے تو یہ بھی اس کی موت ہے۔ اسی لیے اقبال ایسے تصورات سے اختلاف کرتے ہیں جو سالک کی جداگانہ شخصیت اور انفرادی تشخص کو ختم کر دیتے ہیں۔ وہ انسان کی مستقل حیثیت، باطنی قوت اور انفرادیت کو ہر حال میں قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔

''بانگِ درا'' میں شامل نظم ''شبنم'' میں اقبال اسی حقیقت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں:

> مجھے بطور قطرۂ شبنم کہا گیا کہ میں فضا کی بلندیوں سے نیچے اُتر کر سمندر میں جذب ہو جاؤں لیکن میں نے سمندر کی ہم آغوشی پسند نہ کی۔ میں وہ شراب نہیں جو مجھے بے خود کر دے۔ میں نے آفاق سے قطع نظر کیا اور برگ لالہ پر گِر کر اسے قوت اور زندگی عطا کی۔[۴۲]

یوں اقبال کے نزدیک خودی کی حفاظت کا مطلب اپنی ذات کی بیداری، اپنے ایمان و اصول کی پاس داری، اپنی انفرادیت کا تحفظ اور اپنی قوتوں کو انسانیت کی تعمیر کے لیے صرف کرنا ہے۔ یہی خودی انسان کو بے عملی، غلامی، تقلید اور بے مقصد زندگی سے بچا کر تخلیق، خدمت اور ارتقا کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

زندہ رُود کا استعارہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ زندگی کا بہترین مصرف دوسروں کو فیض پہنچانا ہے، مگر اس فیض رسانی کے باوجود اپنی خودی اور انفرادی تشخص کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس طرح زندہ رُود کا سارا پانی دوسروں کو زندگی عطا کرتا ہوا زمین میں جذب ہو جاتا ہے، مگر اپنی بقا کے لیے کسی دوسرے دریا یا سمندر میں گم نہیں ہوتا، اسی طرح اقبال کے نزدیک انسان کو خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ اپنی خودی کی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔

اقبال نے خودی کی حفاظت کے لیے سخت کوشی، محنت اور مشقت کو لازمی قرار دیا ہے۔ انہیں مسلمانوں کی تن آسانی، عیش پسندی، آسائش طلبی اور بے عملی سخت ناپسند ہے۔ ان کے نزدیک یہی رجحان قوموں کو شمشیر و سناں سے دور کر کے چنگ و رباب کا اسیر بنا دیتا ہے، اور بالآخر ان کی قوتِ حیات کو کمزور کر دیتا ہے:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی[۴۳]

اقبال کے نزدیک بے نیازی اور استغنا ہی مسلمانوں کو سربلند رکھ سکتے ہیں اور ان کی خودی کو محفوظ بنا سکتے ہیں:

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں
زِرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا[۴۴]

اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ افراد اور قومیں اپنے وسائل پر بھروسا کریں اور دوسروں کی دست نگر نہ بنیں۔ اگرچہ تیسری دنیا کے کئی ممالک ظاہری طور پر استعماری تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں، مگر معاشی استحصال نے انہیں بدستور طاقت ور اقوام کا محتاج بنا رکھا ہے۔ اقبال اس صورتِ حال میں خود انحصاری اور اپنے وسائل کی حفاظت کا درس دیتے ہیں:

از فریب او اگر خواہی اماں
اشترانش را زِ حوضِ خود براں[۴۵]

خدا نے ہر قوم کو زندگی کے وسائل عطا کیے ہیں؛ اس لیے ضروری ہے کہ قومیں اپنے وسائل سے کام لیں، اپنی انفرادی اور اجتماعی ہستی قائم رکھیں اور بقائے وجود کے لیے مسلسل عمل، پیکار اور جہاد میں مصروف رہیں۔ ''مقدمہ اسرارِ خودی'' میں اقبال لکھتے ہیں:

میری رائے میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی قائم رکھے۔[۴۶]

اقبال اپنے خطبہ بعنوان ''اسلامی ثقافت کی روح'' کے آغاز میں عبدالقدوس گنگوہی کا قول نقل کرتے ہیں:

محمد عربیؐ برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ! اگر من رفتمے ہر گز باز نیامدے

ایک بہت بڑے صوفی عبدالقدوس گنگوہی کا قول ہے کہ محمد ﷺ عرش معلی پر گئے اور واپس آ گئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں گیا ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔[۴۷]

اس قول کے ذریعے اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کمالِ وصال کے باوجود اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھا اور عالمِ انسانیت کی رہنمائی کے لیے واپس تشریف لائے۔ اس کے برعکس بعض صوفیانہ تصورات میں فنا کو منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے، جس سے انسان عمل، کشمکش، پیکار اور جہادِ

حیات کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اصل حیات یہی حرکت، جدوجہد اور تخلیقی عمل ہے۔

"جاوید نامہ" میں بھی یہی کیفیت سامنے آتی ہے۔ جب حوریں زندہ رُود کو بہشت میں مستقل قیام کی دعوت دیتی ہیں تو وہ وہاں ٹھہرنے کے بجائے واپس آنا پسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ مسافر جو سفر کے اسرار سے واقف ہو، منزل کو بھی رہزن سے کم خطرناک نہیں سمجھتا۔ اقبال عالمِ وصال کے بجائے عالمِ فراق کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ فراق ہی میں حرکت، کوشش، پیکار اور تخلیقی زندگی کا امکان موجود ہے۔ یہی زندہ رُود کا حقیقی تشخص ہے۔

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ زندہ رُود کی چاروں صفات اقبال کی فکری شخصیت میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ وہ رواں بھی ہیں، خود کفیل بھی؛ دوسروں کے لیے نفع بخش بھی ہیں اور اپنی انفرادیت کے محافظ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومیؒ کی طرف سے "جاوید نامہ" میں اقبال کے لیے تجویز کردہ نام "زندہ رُود" ان کی معنوی اور فکری شخصیت کا نہایت موزوں استعارہ بن جاتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، ضرب کلیم، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص۵۳۸،

۲ عبدالحق، ڈاکٹر، تنقید اقبال اور دوسرے مضامین، دہلی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۲ء، ص۱۷

۳ نذیر نیازی، سید، تشکیل جدید الٰہیّاتِ اسلامیہ، لاہور، بزم اقبال، ۲۰۱۲ء، ص

۴ ایضاً، ص۱۶۱

۵ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص۱۹۳

۶ میر تقی میر، کلیاتِ میر، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۵۰ء

۷ غلام فرید، خواجہ، دیوانِ فرید، خان پور / رحیم یار خاں، جھوک پبلشرز، ۱۹۹۳ء

۸ محمد پادشاہ، فرہنگ انندراج، تہران، مترجم خورشیدی، ۱۳۳۶ھ۔

۹ محمد حسن خان، مراۃ البلدان، ج: اول، تہران، ۱۳۳۷ھ، ص ۱۰۱

۱۰ محمد پادشاہ، فرہنگ انندراج، تہران، مترجم خورشیدی، ۱۳۳۶ء۔

۱۱ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال فارسی، جاوید نامہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۹۸۲

۱۲ سید اکرم شاہ، ڈاکٹر، اقبال۔ایک تحریک، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء ص ۴۷

۱۳ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ضربِ کلیم، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۵۸۶

۱۴ القرآن الحکیم، ۲۱: ۳۰

۱۵ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، ارمغانِ حجاز، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۷۳۵

۱۶ انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کے کلاسیکی نقوش، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۸ء ص

۱۷ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۳۷۹

۱۸ ایضاً، ص ۴۵۴

۱۹ ایضاً، ص ۲۸۷

۲۰ چشتی، یوسف سلیم، اسرارِ خودی (شرح)، دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۲۱ء، ص ۱۱۲

۲۱ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، بالِ جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۳۶۷

۲۲ ایضاً، ص ۶۱۳

۲۳ ایضاً، ص ۳۸۴

۲۴ ایضاً، بانگِ درا، ص ۳۰۱

۲۵ ایضاً، ص ۶۶

۲۶ میر درد، خواجہ، دیوان خواجہ میر درد، دہلی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۳ء

۲۷ القرآن الحکیم، ۵: ۲۔

۲۸ سیوطی، امام، الجامع الصغیر للسیوطی، بیروت، لبنان، دار الکتب العلمیہ، حدیث نمبر ۴۱۰۳۔

۲۹ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، بالِ جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۴۱۴

۳۰ ایضاً، ص ۱۳۲۳۔

۳۱ ایضاً، ص ۳۹۲۔

۳۲ ادارہ روزنامہ شمس، ملتان، ملت اور وطن، ۱۹۳۸ء۔

۳۳ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اُردو، ارمغانِ حجاز، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۷۵۴

۳۴ نذیر نیازی، سید، اقبال کے حضور، لاہور، القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۸

۳۵ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال فارسی، زبورِ عجم، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۶۲۹

۳۶ عطاءاللہ، شیخ، اقبال نامہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۳۴۵۔

۳۷ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال فارسی، مثنوی مسافر، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۳۷ / ۸۶۹

۳۸ ایضاً، مثنوی مسافر، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۱۴

۳۹ القرآن الحکیم، ۹۱: ۹، ۱۰

۴۰ ایضاً

۴۱ ایضاً

۴۲ چشتی، یوسف سلیم، لاہور، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، ص: س، ن۔

۴۳ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص: ۴۴۷

۴۴ ایضاً، ص ۳۶۰،

۴۵ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال فارسی، پس چہ کرد، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۷۰

۴۶ چشتی، یوسف سلیم، مقدمہ اسرارِ خودی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۴۰ء، ص: ۱۵۔

۴۷ نذیر نیازی، سید، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، لاہور، بزم اقبال، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۰